Scan: http://dli.iiit.ac.in/
PDF: http://www.KetabFarsi.com/

جامعۂ عثمانیہ کے
کتب خانے کے لیے!

عمر الیافعی
۲۲/۱۱ ۱۵ء

دیوان

حکیم الممالک مولوی حکیم عبد الباسط المتخلص عشق

موسومہ

ترانۂ عشق حصۂ اول

مشتمل بر

غزلیات و رباعیات فارسی

دیباچہ

حکیم عبدالباسط المتخلص بہ عشق

مولوی مہدی واصف مشہور مصنف کے فرزند اکبر ہیں۔ مہدی صاحب کی تصانیف نے دکن میں خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی سب سے پہلے انہوں نے اُردو کا لغت فارسی میں لکھا اور اُردو انگریزی ڈکشنری ترتیب دی وہ نہ صرف علوم مشرقیہ کے یگانۂ روزگار عالم تھے بلکہ انگریزی ترکی اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اُن کی فارسی تصنیف "حکایات دل پسند" جس میں امثال لقمان کو انگریزی سے نثر فارسی کا جامہ پہنایا گیا ہے ہندوستان کے اکثر مدارس میں زیر درس رہی اور مختلف مطابع میں چھپ چکی ہے۔ انہوں نے علاوہ دیگر تصانیف کے فارسی کا ایک مختصر لغت اور فارسی محاورات پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور ایک تذکرہ "معدن الجواہر" نامی بھی لکھا ہے۔ جس میں اپنے ہمعصروں اور فارسی زبان کے مشہور شاعروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ ان کے دو مختصر دیوان بھی۔ فارسی اور اُردو میں موجود ہیں مولوی مہدی واصف کے والد عارف الدین خاں ذوق بھی فارسی کے مشہور شاعر اور دربار والاجاہ (مدراس) میں خاص عزت و منزلت رکھتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ راقم الحروف نے ان کا دیوان مع مختصر حالات کے شائع کر دیا ہے۔

الغرض حضرت عشق کے خاندان میں ملکۂ شاعری ورثتاً چلا آرہا ہے چنانچہ وہ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

نازم ز سخن عشق رسید ست بدستم
میراث گرانمایۂ جد و پدر من

"تذکرۂ گلزار اعظم" کی تصریح کی بموجب جس کو نواب غلام غوث خاں آخری یادگار خاندان والاجاہی نے شعرائے والاجاہی کے حالات میں ترتیب دیا ہے حکیم عبدالباسط عشق کی پیدائش سنہ ۱۲۳۳ھ میں بمقام مدراس ہوئی۔ وہیں انہوں نے ہوش سنبھالا اور اپنے والد مولوی مہدی واصف اور اپنے ماموں حاجی زین العابدین سے جو اس زمانہ کے فارسی کے جید اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے نیز نواب خان عالم خاں فاروقی سے جو علم و فضل کے ساتھ فن شعر میں بھی کمال رکھتے تھے عربی فارسی کی درسی کتابوں کی تکمیل کی اور اس کے بعد مدراس کے میڈیکل کالج میں جو وہاں پہلے پہل قائم کیا گیا تھا شریک ہو گئے اور ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ ان کا اس زمانہ کے مشہور و معروف ڈاکٹروں میں شمار تھا۔ اور وہ سرجری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کا کتب خانہ دیکھا ہے جو کئی المارئیوں پر مشتمل تھا جس میں ڈاکٹری کے ہر فن پر بیش بہا کتابیں فراہم کی گئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فن سے کس قدر شغف تھا۔ اور ان کا مطالعہ اور ان کی نظر اس فن پر کس قدر وسیع تھی باوجود اس حذاقت و مہارت طبی کے انہوں نے اس شریف پیشہ کو اپنا ذریعہ آمدنی نہیں بنایا۔ بلکہ اپنے دوست احباب اور غریب غربا کا علاج مفت کرتے تھے۔ بسا اوقات ان کی دواؤں کے اخراجات بھی خود اٹھاتے تھے اس فیاضی اور سیرچشمی کی وجہ سے اکثر مقروض اور تنگدست رہتے تھے لیکن بایں ہمہ کبھی انہوں نے اپنا طریقہ نہیں بدلا۔ ان کی انگریزی قابلیت اور مہارت و حذاقت طبی کے متعلق گلزار اعظم میں لکھا ہے :-

"زبان انگریزی دیا نزدہ فن طب انگریزی از مستندان اہل لسان آموختہ و بہرہ وافی اندوختہ"

ان کے والد مولوی مہدی واصف اپنی تصنیف "حدیقۃ المرام" میں ان کی نسبت لکھتے ہیں :-

"شاب ذکی لہ مہارۃ فی العربیۃ والفارسیۃ والانجلیزیۃ لاسیما فی علم الطب لہ

حذاقۃ کاملہ" گلزار اعظم میں لکھا ہے کہ حضرت عشقؔ مدراس میں ایک ہفتہ وار اخبار "تمیز الاخبار" بھی نکالتے تھے لیکن معلوم نہیں ہوا کہ یہ اخبار فارسی میں تھا یا اردو میں افسوس ہے کہ کہیں اس اخبار کے پرچے دیکھنے میں نہیں آئے۔ ورنہ بہت سے حالات پر روشنی پڑتی۔

حضرت عشقؔ نے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اگرچہ اپنے والد اور ماموں سے فارسی، عربی، درسی کتب کی تحصیل فرمائی تھی لیکن کلام کی اصلاح خان عالم خاں بہادر فاروقؔ سے لیا کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد کو استاد سے اور استاد کو شاگرد سے خاص ربط و تعلق تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔

زشعر پر اثرم عشقؔ اثر ہویدا شد — دعائے حضرتِ فاروقؔ برگزین مرا

ایک دوسرے شعر میں استاد سے جدائی پر اس طرح افسوس کرتے ہیں۔

جدا ز حضرتِ فاروقؔ تا شدم اے عشقؔ — زیاد رفت سخن خاطر حزین مرا

"اشاراتِ بینش" میں لکھا ہے کہ فاروقؔ نے مولوی سید ولدار علی کی تصنیف پر جو غالباً مذہب شیعیت کی تائید میں لکھی گئی تھی۔ یہ رباعی موزوں کی تھی۔

ولدار علی کہ دادِ تالیف بداد — اثنا عشریہ را نمودہ برباد
اعنی ز صوارم و حسام اسلام — بر گردن ہر شیعی منت بنہاد

اس کا جواب سعید بیگ طلبؔ نے یوں دیا۔

فاروقؔ بنائے ایں رباعی چو فگند — ز انصاف ہمہ شیعہ و سنی گفتند
اکنوں ز صوارم و حسام اسلام — البتہ نمود نیست قطع پیوند

حضرت عشقؔ نے اپنے استاد کی حمایت میں کئی رباعیاں لکھ کر بھجوائی تھیں جن میں سے حسب ذیل دو رباعیاں تذکرہ گلزار اعظم میں درج ہیں۔

نا مژدہ قطع دادہ بے طلبم — ممنون تو اے سعید بیگ طلبم

فاروقم و بہر قطع ہر بدعت و شرک ——— شمشیر محمد و علی می طلبم

اے اہل صلاح کیش ارباب فساد ——— دارد بر کذب و زور و بہتاں بنیاد

بر قطع ز فاروق کہ امیں سنی ——— بار افض سب طلب موافق افتاد

یہ وہ زمانہ تھا کہ خاندان والاجاہی کی بساط حکومت سمیٹی جا رہی تھی اور غدر سے کچھ دنوں پہلے ہی اطراف و اکناف ہند سے علماء و فضلاء کے قافلے حیدرآباد کو اسلامی مرکز خیال کر کے چلے آ رہے تھے خود اس خاندان کے بہت سے افراد حیدرآباد پہنچ چکے تھے۔ حضرت عشق کے والد چچا اور دادا حیدرآباد آ چکے تھے نواب شمس الامراء بہادر اور ان کے بعد نواب سالار جنگ اول جن کو اہل کمال کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے خاص دلچسپی تھی اطراف و اکناف ہند سے علماء و فضلاء اور شرفاء کو دعوت دے دے کر بلا رہے تھے اور ہر شخص کو اس کی قابلیت اور مرتبہ و منزلت کے لحاظ سے خدمات و مناصب عطا فرما کر اپنی علم پروری اور معارف نوازی کا ثبوت دے رہے تھے۔ جس کی وجہ سے حیدرآباد اہل فضل و کمال کا اچھا خاصہ مرکز بن گیا تھا۔

حضرت عشق اپنی جوانی کا ایک معتدبہ حصہ مدراس میں گزارنے کے بعد تلاش روزگار میں میسور چلے گئے۔ اور وہاں محکمہ مال میں انہیں ایک معقول خدمت مل گئی۔ چونکہ اکثر اعزہ و احباب حیدرآباد چلے گئے تھے۔ اس لئے ان کا دل میسور میں نہ لگا۔ چند سال وہاں رہنے کے بعد وہ اکتا کر یہاں چلے آئے۔ غالباً حیدرآباد میں ان کا ورود ۱۲۷۹ھ ہجری کے بعد کا واقعہ ہے۔

کیونکہ حدیقۃ المرام میں جو سن مذکور میں طبع ہوئی ہے۔ مہدی واصف نے میسور میں ان کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔

تذکرہ گلزار اعظم ۱۲۶۹ھ میں تصنیف ہوا ہے اس میں جو حالات درج ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے اس وقت حضرت عشقؔ مدراس میں مقیم تھے۔ غالباً اس کے بعد ہی وہ میسور گئے ہیں۔ اس لحاظ سے میسور کا زمانہ قیام آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔

یہاں آنے کے بعد نواب سالار جنگ اول نے ان کے فضل و کمال کی قدردانی فرمائی اور انہیں دفتر دیوانی میں سررشتہ داری کی خدمت تفویض ہوئی اس کے بعد جب نوادر خانہ کے نام سے ایک عجائب خانہ قائم ہوا تو وہ اس کے مہتمم بنائے گئے۔ جب "نوادر خانہ" بے ضرورت سمجھ کر برخواست کیا گیا۔ تو حضرت عشقؔ کو پوری تنخواہ کا وظیفہ کر دیا گیا کہ ان کے علاج معالجہ سے مخلوق خدا کو بہت فیض پہنچتا تھا لیکن کبھی کبھی ان سے علاقہ دیوانی کے بعض امراء کے علاج معالجہ کا کام لیا جاتا تھا۔

حیدرآباد آنے کے بعد ان کا زیادہ تر مشغلہ علاج معالجہ اور درس و تدریس اور شعر و شاعری تھا۔ شطرنج بھی بہت شوق سے کھیلتے تھے اور یہ شوق بھی کچھ شاعری کی طرح ورثتاً ملا تھا۔ کیوں کہ ان کے دادا عارف الدین خان رونقؔ کی نسبت بھی سنا گیا ہے کہ ان کو بھی شطرنج کا بہت شوق تھا۔
غالباً اپنی اس بیکاری کی جانب ہی انہوں نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

دمبدم حسرتِ ہر کار بمن میگوید
کہ زبیکاری خود عشقؔ چہا نتواں کرد

اپنے ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں۔

فرصت نشد کہ شکوہ زکم فرصتی کنم
بیکار بسکہ می گزرد روزگار من

اتفاق سے ان دنوں حیدرآباد میں اچھے اچھے سخن گو اور سخندان اصحاب جمع ہو گئے تھے۔

مثلاً منشی حبیب اللہ ذکاؔ۔ امیر اللہ صاحب امیرؔ سالکؔ وغیرہم۔ اس مجمع اہل کمال میں ہمیشہ شعر و سخن کے چرچے رہتے اور مشاعرہ کی مجلسیں گرم ہوتیں۔ حضرت عشقؔ اکثر ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے یہ دیوان زیادہ تر اسی زمانہ کی غزلیات پر مشتمل ہے ان کے زمانۂ جوانی کا کلام ضائع ہو گیا۔ اگر ان کے تمام افکار کو جمع کیا جاتا تو کئی ضخیم دیوان ہوتے ان کی پُرگوئی مشہور تھی جب شعر کہنے پر آتے تو سیکڑوں شعر کہتے چلے جاتے تھے۔ والد مرحوم اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اس قدر جلد جلد فکر شعر فرماتے تھے کہ ہم لوگ ان کے اشعار کو قلم بند نہیں کرسکتے تھے۔ اس کی تصدیق گلزار اعظم سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں لکھا ہے

"غزل و قصیدہ بکمال سرعت می نگارد"

اس دیوان میں جو غزلیات ہیں ان سے بھی ان کی پُرگوئی اور روانیٔ طبع کا کافی پتہ چلتا ہے چنانچہ ایک ہی بحر و ردیف میں آٹھ آٹھ دس دس غزلیں ملتی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا کوئی قصیدہ ہمدست نہیں ہوا۔ قصیدہ کے میدان میں ان کے زور طبیعت کا اور زیادہ اندازہ ہوسکتا تھا اپنی پُرگوئی اور زود فکری کی وجہ سے وہ اپنے ہمعصروں میں خاص امتیاز رکھتے تھے اور اکثر امتحانی مواقع پر اپنی اس خداداد قابلیت کی وجہ سے کامیاب رہے اور اپنے ساتھیوں پر گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

یاد آں زماں کہ عشقؔ بمیدان امتحان
از ہر کہ بود گوئے سخن ماربودہ ایم

مولوی عبدالواجد صاحب فرزند مولوی عبدالعلی صاحب والہؔ کو اپنے بزرگوں کے آثار جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ صاحب دیوان ان کے نانا ہوتے تھے اور ان سے تلمذ بھی تھا۔ ان کو ان کے کلام کے جمع کرنے کا خیال ہوا لیکن حضرت عشقؔ کے پاس سوائے چند مسودہ غزلیات کے

جو متفرق پُرزوں پر لکھے گئے تھے۔ کوئی ذخیرہ نہیں تھا۔ نواب اسد علیخاں صاحب جو حضرت عشق کے قدیم دوست تھے۔ ان کے پاس بھی کچھ کلام موجود تھا جس کو حضرت موصوف نے ان سے حاصل کرکے مولوی عبدالواجد صاحب کے حوالہ کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے حضرت عشق کے زمانہ میں ہی ان کی اردو غزلیات جس قدر مل سکیں ان کو صاف کرکے صاحب موصوف نے ایک مجموعہ ترتیب دے لیا تھا۔ جس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عشق کے ایما رسے انہوں نے اس کا نام " ترانۂ عشق " رکھا ہے۔ لیکن فارسی کلام بجز چند غزلیات کے صاف ہو سکا اور بہت سے پرزے مسودہ کی حالت ہی میں پڑے رہے اور ان کے مرتب اور ایک جگہ فراہم کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ حالانکہ ان کا فارسی کلام ہی زیادہ اعتنا کا مستحق تھا کیوں کہ وہ درحقیقت فارسی کے شاعر تھے۔ اردو میں وہ بطور تفنن طبع کے شعر کہا کرتے تھے۔ دوتق ان کے دادا ان کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکر شعر کرتے ہوئے دیکھ کر منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کسی ایک زبان کو اختیار کرو کیوں کہ یکتا یکتا ہوتا ہے۔

الغرض مولوی عبدالواجد صاحب کے انتقال کے بعد یہ ذخیرہ میرے حوالہ ہوا۔

میرے پاس بھی تقریباً ۱۴ - ۱۵ برس پڑا رہا۔ اصلاع کے قیام اور عدالتی کام کے انہماک کی وجہ سے مجھے اس کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سچ پوچھئے تو "کل امر مرہون باوقاتہ"۔ چند دن پہلے جب میں اپنے پاس کے قلمی مسودات کو دیکھ رہا تھا تو یہ مجموعۂ پریشان بھی میری نظر سے گزرا اور مجھے خیال ہوا کہ "کیف ما اتفق" اس کو مرتب کرکے شائع کر دینا چاہیئے۔ تاکہ حضرت عشق کی یادگار باقی رہے اور شعرائے دکن کے تذکرہ پڑھنے والے کو اگر ان کے کلام کے دیکھنے کا خیال ہو اور وہ اس کی نسبت بطور خود آزادانہ کوئی رائے قائم کرنا چاہے تو کچھ نہ کچھ مواد مل سکے۔ تذکروں میں جو معدودے چند انتخابی اشعار لکھے جاتے ہیں۔ وہ درحقیقت تذکرہ نویس کے ذوق انتخاب کے رہین منت ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق کلام کا انتخاب کرتا ہے

جس سے کوئی صحیح اور مستقل رائے کسی شخص کے کلام کی نسبت نہیں قائم کیجا سکتی۔
غالباً طبیعت کی بے پروائی نے خود حضرت کو کبھی اپنے کلام کے جمع کرنے کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیا اور اس بے پروائی اور بے توجہی کا نتیجہ تھا کہ اکثر کلام منتشر اور ضائع ہوگیا چنانچہ خود ایک جگہ کہتے ہیں۔

ناقدردان جہاں نبود کس چو من کہ من
جنسِ گراں بہائے سخن را ئیگاں کنم

مدراس کے شعرا میں دو مکتب خیال کے شعرا تھے ایک تو وہ جو خیال بندوں کے پیرو اور دقت پسندی اور خیال آفرینی کو منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ اور دوسرے وہ جو معنوی خوبیوں کے ساتھ زبان اور لطفِ بیان اور صفائی کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ رونق اور مہدی واصف موخرالذکر گروہ کے ہمخیال تھے اور چونکہ حضرت عشق کی تعلیم و تربیت زیادہ تر اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی اس لئے ان کے کلام میں زبان اور محاورہ کی چاشنی زیادہ ہے اور کلام میں پرگوئی کی وجہ سے صفائی اور روانی کا دریا موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

عشق است دکنوں گاہ گہے نازِ سر دے
کو لطفِ بیانش چہ شد آں طبع روانش

باوجود اس کے وہ متاخرین کے خیال بندانہ طرزِ سخن گوئی سے نہ بچ سکے اس دیوان میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو باوجود سادگی اور صفائی بیان کے مضمون و معنی کے لحاظ سے دقت پسندی اور خیال آفرینی کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ چنانچہ اس کی جانب وہ خود اپنے ان اشعار میں اشارہ فرماتے ہیں۔

زعجز فہم چہ اعجاز ہاست یاراں را	کہ بستہ اندلب سحر آفرین مرا
اگرچہ آب بود از صفائے گوہر خویش	تو نقش سنگ بداں شعر دلنشین مرا

سخن عشق بر دسر مگو
کہ زباں برہنہ گو نیست مرا

خوں کردہ ام بسینۂ دل درد ہاں لبا زیں گونہ عشق میں کہ چہ رنگیں بیاں کنم
گردم ہلاک فہم رسائے معاصراں دانستہ خویش را نہ اگر بیزباں کنم

ایک اور شعر میں اور زیادہ صاف طریقہ پر اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

مستمع سرگشتۂ ہر وادئے چوں قیس باش
لیلیٰ گفتار ما را چند محمل کردہ اند

یعنی ہماری بات کو سمجھنے کے لئے سننے والے کو چاہئے کہ وہ قیس عامری کی طرح مختلف وادیوں میں (مضمون و معنی کی) سرگردانی کرے۔ کیوں کہ ہماری لیلائے گفتار کے کئی ایک محمل ہیں جب تک ان سب میں تلاش و جستجو نہ کرلی جائے وہ نظر نہیں آسکتی اس شعر میں معنی آفرینی اور دقت پسندی کو نہایت لطیف تمثیل میں ظاہر کیا ہے۔ محمل کا لفظ بہت پر لطف واقع ہوا ہے کہ کلام کے محمل کی جانب بھی ایہام ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک کلام کے کئی محمل ہوتے ہیں جب تک سامع کی نظر ان تمام محملوں پر نہ رہے وہ اس کی وسعت و عمومیت کو کما حقہٗ نہیں سمجھ سکتا۔

حضرت عشق کی وفات ۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۲ھ میں ۶۴ برس کی عمر میں ہوئی۔ اور قبرستان گلباغ واقع محلہ ترپ بازار (بلدۂ حیدرآباد) میں تدفین عمل میں آئی۔ حضرت عشق کی پہلی بیوی خواجہ غلام حیدر ولد خواجہ منصور علی خاں کی بیٹی اور سید عبد القادر شہید ولد سید نظام الدین بیجاپوری میر منشی و کاتب والاجاہ کی نواسی تھیں۔ خواجہ منصور علی خاں دستگیری کے نوقلعوں کے قلعہ دار تھے اور ٹیپو سلطان کے ہنگامہ میں شہید ہوئے پہلی بیوی کے بطن سے مولوی عبدالحی صاحب وصف۔ ملا عبدالقیوم مرحوم احقر کے والد اور عبدالغنی صاحب اور دو لڑکیاں ہوئیں اور دوسری بیوی سے عبدالسلام صاحب اور ایک لڑکی ہوئی جن میں سے اب کوئی بقید حیات نہیں ہیں۔

حلیہ ولباس

حضرت کا حلیہ حضرت کے نبیسہ مولوی عبد الرب صاحب مظلہٗ سے اس طرح منقول ہے:۔
رنگ سُرخ وسپید۔ ہونٹ پتلے۔ پیشانی بلند وبالا، ناک ستوان۔ قد متوسط سے کسی قدر نکلتا ہوا کاسۂ سر ضخیم نحیف الجثہ۔ گرد داڑھی۔ تاپا پہنتے اور عمامہ باندھتے تھے۔ حضرت کے پایانِ عمر کے حالات کے متعلق اثنائے طبع دیوان میں مولوی عبد الربؒ صاحب مدظلہٗ نے میری استدعا پر جو تحریر روانہ کی تھی۔ اس سے ان کی خانگی زندگی اور اخلاق وعادات پر کافی روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کا ضروری اقتباس بجنسہٖ علیحدہ درج کردیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف تذکروں میں جو کچھ حالات اور اشعار ملے وہ بھی نقل کردئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کے چیدہ انتخابی اشعار کو جو ترتیب دیوان کے وقت نظر سے گذرے درج کرتے ہیں ان میں سے بعض اشعار کی برموقع ضروری تشریح بھی کردی جائے گی۔ اور محاسن اشعار کی جانب بھی کہیں کہیں اشارات کردئے جائیں گے۔

منتخب اشعار

صبا

زگرد کلفتِ غم نیست چیں جبیں مرا — کہ برکشید بردوش سر آستین مرا

شوق

بغیر سجدۂ شوقت ازاں نریزد ہیچ — ہزار بار فشانند اگر جبین مرا

عاشقانہ

زدست رفتہ دل پارہ پارہ ام بنگر — بحلقہ حلقۂ زلفت نگین نگین مرا
چہ گویمت کہ براہ وفا چساں رفتم — دلم گرفتہ بسیار دیگر ببین مرا

اس شعر کے مصرع ثانی نے شعر میں ایک خاص شان اور کیفیت پیدا کر دی ہے کہتے ہیں کہ راہِ وفا کو میں نے اس طرح طے کیا ہے کہ جیگر بیرے دہنے بازو کو اور دل بائیں بازو کو تھامے ہوئے تھا۔ شعراء کے پاس تمام مصائب دل و جگر پر وارد ہوتے ہیں اور انہی کی مدد اور طاقتِ برداشت پر راہِ محبت کا طے کرنا موقوف رہتا ہے شاعرانہ تخیل نے ان کو دو اشخاص مددگار و معاون کی حیثیت دیدی جو دہنے اور بائیں شاعر کو تھامے ہوئے اس سے راہِ محبت طے کرا رہے ہیں اس میں لطف یہ ہے کہ جسمِ انسانی میں دل اور جگر کے مقام کے لحاظ سے یمین و یسار کے الفاظ بہت موزوں واقع ہوئے ہیں۔ یہ شعر حسنِ تخیل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

وفورِ گریہ

بدیدہ اشک چو قربِ کردہ ام ہمی بینم — کہ تار راز رگِ ابرست آستین مرا

توصیف

نگر بزلف و رخ و قد و آں تنِ نازک — بہار سنبل و گل و سرو و یاسمین مرا

جدائی

بعد از نیم مکن از خویشتن اے یار جدا — بودہ آہ جدا از من و بسیار جدا

اظہار اشتیاق

پردہ بردار و بیا حرف نہان میکشدم — شوقِ دیدار جدا حسرتِ گفتار جدا

ان دونوں اشعار کا تغزل اور لطفِ زبان بطورِ خاص قابلِ ملاحظہ ہے۔

توحید و تصوف

اے مہر رخت مطلع انوار یقین ہا — وے سلسلہ زلف تو شیرازۂ دیں ہا

اے آئینۂ سجدۂ شوق تو جبین ہا — وے دیدۂ مردم برہت خاک نشیں ہا

عاشقانہ

اے شادیِ عشاق کجائی خیرتیست — در گریۂ زار اند ز دردِ تو حزیں ہا

مثلِ تو ز خوبان نشنیدیم نہ دیدیم — بسیار بدیدیم و شنیدیم ازیں ہا

حسن است کہ کارِ نگہ از گوش بگیرد — سرگشتہ بہر سوئے ز تو گوشہ نشیں ہا

یہ پوری غزل مرصع لکھی ہے۔ آخری شعر میں ایک نیا مضمون باندھا ہے۔

کہتے ہیں کہ حسن کے کرشمے ایسے ہیں کہ "نگاہ" کا کام "گوش" سے لیا جاتا ہے اگرچہ وہ کسی کو نظر نہیں آیا لیکن اس کے اوصاف کو سن کر بہت سے گوشہ نشین سرگشتہ اور دیوانہ ہوگئے۔ جو بات دیکھ کر پیدا ہونی چاہیے تھی وہ محض سن کر پیدا ہوگئی "گوش" اور "گوشہ" میں صنعت تجنیس بھی ہے۔ گوشہ نشین سے زاہدانِ خلوت نشین کی طرف اشارہ ہے شعر میں بہ نسبت مجاز کے حقیقت کا پہلو غالب ہے۔

عاشقانہ

دادم دلِ صد چاک را بے بہرہ از ادراک را — آں نرگسِ بے باک را آں غمزۂ سفاک را

درہا شادیِ جانِ من بنگر در پیرہن — دارد بدستِ خویشتن زاں صبح ہم یک چاک را

مطلب یہ ہے کہ میرے چاک ہائے گریبان میں خوشی و شادمانی کا سامان پوشیدہ ہے یہ گویا فرحت و مسرت کے دروازے ہیں۔ چنانچہ صبح نے بھی ایسے ہی ایک چاک کو حاصل کرکے مسرت و انبساط کا سامان فراہم کیا ہے۔ پو پھٹنے کو شعرا چاکِ گریباں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ شبِ ہجران کے مصائب کا خاتمہ صبح نمودار ہونے پر ہوتا ہے۔

عاشقانہ

تا زد خدنگِ شوخ سوارِ سمند را — کز سینہ دور کرد دلِ دردمند را

تا کامیاب چشم ز برقِ جمالِ اوست — سوزد سپند اشک علاجِ گزند را

عاشقانہ

بنگر لطافِ ابروئش جانِ من بیتاب را   قندیلِ دل سوزے کہ روشن میکند محراب را
پیشِ بصیرت سربسر فرقِ نگاہ و آہ نیست   تا دیدۂ مشتاق کردی ہر دلِ بیتاب را

نیا مضمون اور نئی تشبیہ ہے نگاہ کا تعلق آنکھ سے اور آہ کا دل سے ہے چونکہ دلِ بیتاب دیدۂ مشتاق بن گیا ہے اس لئے کہتے ہیں آنکھوں میں نگاہیں نہیں ہیں بلکہ دلِ بیتاب کی آہیں ہیں۔ اس طرح درحقیقت نگاہ و آہ میں کوئی فرق نہیں رہا۔

عاشقانہ

گہ موجِ دریا گشتہ ام ماندم گہے گرداب را   بسیار کردم جستجو آں گوہرِ نایاب را
سیرم نسازد شربتے سوز دہاں لب تشنگی   گر لعلِ جاں بخشش کسے خواہم کشیدن آب را
گر صد ملامت می کنی اثر نا شکایت نشنوی   بر سازِ بے آوازِ ما اے جاں مزن مضراب را
عقلِ سبک سر عاقبت عاجز بشد در جوشِ عشق   آرے خسے گیرد عناں چوں تند رو سیلاب را

مذکورۃ الصدر تمام اشعار لطیف و نازک تشابیہ سے مملو ہیں۔ عام طور پر اُن کے ہاں تشبیہ و استعارہ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

تصوّف

در ضمیرم چو جز او نیست مرا   نفسے نیست کہ ہو نیست مرا

عاشقانہ

پائے آں سروِ رواں چوں بوسم   لب بکامِ لبِ جو نیست مرا

اخلاق

فرصتم نیست ز شکرت اے دوست   کہ شکایت ز عدو نیست مرا

عاشقانہ

منور می کند خورشیدِ رویش چشمِ دیدن را   حدیثِ او نماید پُرگہر گوشِ شنیدن را

من بیدست و پا تا کے نیایم ہم گل چاکے — جنوں دستے عطا کن جیب و دامانم دریدن را

دل افگار محو خار خار او ہمی باشد — چہ لذت می دہد شوخیٔ مژگانش خلیدن را

حجاب جلوۂ جاناں ز من آسودہ پیداست — دو چشم خود تصور کردہ ام دیدن نہ دیدن را

ز بس فریاد بیہم از دل بے مدعا دارم — چہ رنج از من شنیدن را چہ زحمت ناشنیدن را

اسیرا دنیفتد ہیچ گہ در بند آزادی — کہ دارد در گرہ ہر حلقۂ دامش رہیدن را

توانم عشق پر کردن کنوں داماں صد حسرت
کہ خرمن کردہ ام زیں باغ گلہائے نچیدن را

خیال بندانہ شعر ہے۔ ایک سلبی مضمون کو اثباتی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

عاشقانہ

برقع کسے ندیدہ مہ و آفتاب را — بردار اے نگار ز رویت نقاب را

مست نظارۂ تو مئے نور می کشد — خوش طالعے کہ کرد قدح آفتاب را

بالکل نئی تشبیہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ تجھ کو نظارہ کرنے والا گویا شراب نور پی کر مست ہو گیا ہے وہ اس خوش نصیب شخص کی مانند ہے جس نے آفتاب کو قدح بنا لیا ہو۔ آفتاب کو پیالہ سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ معشوق کا چہرہ بھی مثل آفتاب ہوتا ہے اس کا نظارہ کرنا گویا آفتاب کو قدح بنانا اور شراب نور پینا ہے۔ تشبیہ در تشبیہ نے اس شعر میں خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

تصوّف

ترا از نور تو بینم چو شد بیکار چشم من — ز پیش روئے من ایں پردہ ہا سوئے بکشا

ز سودائے جہاں شد تار بر مردم سرت گردم — بکن یک جلوہ شوخی و بخت دیدہ را بکشا

اس شعر کو الفاظ مناسب کے اجتماع نے اعلیٰ مراتب بلاغت پر پہنچا دیا ہے مضمون کے لحاظ سے بھی شعر نوادر افکار میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ اس میں قدرت کی اس فیاضی کی طرف اشارہ ہے جس کی طلب میں بعض اوقات سارا جہان انسان پر تیرہ و تار ہو جاتا ہے

کہ یکایک برقِ تجلی چمکتی اور تاریکی نور سے اور تکلیف و مصیبت راحت و سرور سے بدل جاتی ہے۔

عاشقانہ

تغافل بندہا بیقراری ہائے من تا کے
گریزان صبر تا گردد رہِ جور و جفا بکشا

اخلاق و تصوف

نگاہِ رحمت او چارۂ دردِ دلم داند
نسیم صبح را گفتش چہ حاجت غنچہ ہا بکشا

عاشقانہ

شرمندۂ نیاز کنم نازِ یار را
تا پرسشے کند منِ زار و نزار را

بے ثباتیِ دنیا

دانم بپا نہ پایہ ایں زندگی بود
ایں سقف بے ستون نہ نیرزد اعتبار را

عاشقانہ

در سوزِ عشق بسکہ بود زندگیٔ دل
ز آتش جدا مساز دمے ایں شرار را

زلف در دیش نگر و دل ز مذاہب بردار
کافرِ زلف بشو جز رخش ایمان مطلب

زلف کو مذاہب سے اور رخسار کو ایمان سے تشبیہ دی ہے۔ زلف کا لازمہ پریشانی ہے اسی طرح مذاہب کی کثرت اور فرقہ بندیاں انسان کے یقین کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ اس لئے شاعر اس مایۂ پریشانی و افتراق کو چھوڑ کر حصولِ ایمان کی جانب متوجہ ہونے کا مشورہ دیتا ہے اس وسیع مضمون کو "کافرِ زلف بشو" اور "جز رخش ایمان مطلب" جیسے مختصر جملوں میں ادا کیا ہے۔

عاشقانہ

درمیاں نیست کنوں چوں سخن بوس و کنار
دل مخواہ از منِ ناکام و دگر جاں مطلب

عاشقانہ

نہ تابِ بدل دارم نہ بر لب شیون است امشب
کہ زلف در ہمش اندوہ من بر ہم زن است امشب

کجا گنجد ز بیماری بدامان سحر آخر
گل عیش و سرورِ من کہ خرمن خرمن است امشب

گرفت از من کنار آں بحرِ خوبی تشنہ می بودم
مقرر بود گوئی از پئے بوس و کنار امشب

چہ خوش خوابیکہ بخت من بہ بیداری ہمی بیند
کہ صیادِ دلِ عالم مرا باشد شکار امشب

اخلاق

کن دور گردِ حرص چو باشی صفا طلب
گر می کشی چراغِ دل خود ہوا طلب

بہت اچھی تشبیہہ و تمثیل ہے۔ فرماتے ہیں اگر دل کی صفائی حاصل کرنی ہو تو حرص کے گرد و غبار کو دور کرو اور اگر یہ مقصود نہیں ہے بلکہ اپنے دل کے چراغ کو بجھا دینا ہی چاہتے ہو تو حرص و ہوا کی پیروی کرو اس کے باعث چراغ دل خود بخود بجھ جائے گا ہوا کا لفظ ذومعنی استعمال کیا ہے ہوا کا چراغ کو بجھا دینا بدیہی الثبوت ہے۔

اظہار مصیبت

بر سرِ فتادہ بار بلا استخوان شکن
زنہار شرحِ آں ز منِ مبتلا طلب

تصوف

دنیا و آخرت طلبِ عام مردم است
بیگانہ شو ز خلق و مراد سے جدا طلب

عاشقانہ

عہد ہائے تو یاد باد ترا
آنچہ تو گفتہ مرا یاد است

بندِ زلفش دراز دید و بخود
دل گماں می برد کہ آزاد است

یہ دونوں شعر سہل ممتنع ہیں۔ موخر الذکر شعر میں ایک وسیع مضمون کو چند مختصر الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دل نے اس کی زلف کی بندھنوں کو دراز دیکھکر

بجائے خود یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ آزاد ہے حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے پرندہ کے پاؤں میں جب لامبی ڈوری باندھی جاتی ہے تو وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ آزاد ہے اور اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بدستور گرفتار ہے یہی حالت دل کی بھی ہے۔

عاشقانہ

روپوش منو یار کہ در خواب خیالت — صد بار بدیدیم و ترا ہیچ خبر نیست
بیچارہ من و چشم ترحم چہ تواں کرد — بستند مرا بر تو چو مردم چہ تواں کرد
از گریہ مرا چارہ نباشد بفراقت — بے مہر تو در جلوہ انجم چہ تواں کرد

اس شعر میں اشکوں کو انجم سے اور معشوق کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے جس طرح آفتاب چھپ جاتا ہے تو تارے نکل آتے ہیں۔ اسی طرح تیرے فراق میں بلا قصد و ارادہ میرے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

عاشقانہ

صد خواہش دل تا بلبم آمد و برگشت — نے صبر و نہ یارائے تکلم چہ تواں کرد
بیزار ز انصاف چو شد یار ستمگار — خاموش نشینیم تظلم چہ تواں کرد
جور است و جفا شیوہ خوبان دل آزار — بالطبع چنیں اند تحکم چہ تواں کرد
آمد کہ برد دل ز ادب ہیچ نہ گفتم — دستے کہ بدل داشتم اش پیش دہن شد

نہایت لطیف پیرایۂ بیان ہے مضمون یہ ہے کہ وہ جب دل لینے کے لئے آیا تو میں بوجہ ادب کچھ کہہ نہ سکا جو ہاتھ دل کو تھامے ہوئے تھا۔ اس نے میرے منہ کو بند کر دیا۔ اضطرار اور مجبوری کی کیفیت کو اس سے بہتر طریقہ پر نہیں بیان کیا جا سکتا

باشد بدلم آنچہ مرا در زبان است — در شکل زبان لخت دل من بدہن شد

زبان اور دل کی موافقت کی یہ ایک بہترین تمثیل ہے

عاشقانہ

می توان آسان رفو کردن دلِ صد چاک را — زاں نگہ گر رشتہ و سوزن ز مژگاں می رسد

نہایت بدیع تشبیہ ہے اور پھر معناً واقعہ کے مطابق بھی ہے۔

تصوف و اخلاق

کشتیِ امید را صد رخنہ ہم ہست و باز — بر کنارِ عفوِ تو از بحرِ عصیاں می رسد

کہتے ہیں کہ امید کی کشتی میں اگرچہ خوف سے کئی رخنے پڑ گئے ہیں لیکن گناہوں کا دریا اس کو عفو کے کنارے پہنچا ہی دیتا ہے۔

عاشقانہ

گرمیِ ہنگامۂ پروانہ یک سر سوختند — تا نگاہِ شوقِ ما را شمعِ محفل کردہ اند

سالکاں را مایۂ آرام شد سرگشتگی (تصوف) — جادۂ دشتِ طلب گوئی کہ منزل کردہ اند

عاشقانہ

با نالۂ جاں سوز بگوشش گزر افتاد — چوں شمع مرا شعلہ رفیقِ سفر افتاد

در بزم چو بر جامِ شرابم نظر افتاد — چشمِ تو بیاد آمد و شیشم ز سر افتاد

عشق است ہمیں پیر و جواں را بسر افتاد — ایں آتشِ تیز است کہ در خشک و تر افتاد

از گریہ و زاریِ شب و روز چہ حاصل — در عشق کسے کار چہ با زور و زر افتاد

بر نامدہ یک زرویش زاں لبِ شیریں — شوریدہ دلِ من بامیدِ دگر افتاد

حیرانِ جمالِ تو ندانم کہ دراں لطف — دل از نظرش یا کہ نظر خیرہ افتاد

نالاں بناامیدی در ہجرِ او چہ باشم — زیں گونہ صد مصیبت چوں خاطرِ نزار باشد

از صبر افزائے آہ ہر چند چارہ جستم — درد دلے کہ دارم در اشتداد باشد

تا صبح [illegible] تا [illegible] سوزم — بر آتشِ درد و غم حرفِ تو باد باشد

سر موئے ز پیچ و تاب زلف او نفہمد دل بیاں چنداں پریشاں شد کہ مطلب از میاں گم شد

مطلب یہ ہے کہ دل نے اس کی زلف کے پیچ و تاب کی تشریح کرنی چاہی لیکن اس کا بیان اس قدر پریشان ہو گیا کہ مطلب ہی درمیان سے گم ہو گیا۔ اس شعر کو حقیقت اور ظاہر دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے

بسان شمع روشن جان من باشد زبان من زبان من اگر گم شد یقیں دانید جاں گم شد

ز من باقی ہمیں بود و سگش را جستجو کردم کف خاک پریشاں گشت و مشت استخواں گم شد

بسنگ ملامت ز سبک مغزاں ہمی باشد تحمل بود گر ما را دریں بار گراں گم شد

یعنے کم سمجھ لوگ موقع و محل کو نہیں دیکھتے۔ ملامت شروع کر دیتے ہیں ایسے وقت بردبار سے بردبار اشخاص بھی اپنے تحمل کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں یہ غزل نظیری کی مشہور غزل پر لکھی ہے۔ اس میں ایسے اشعار کا نکالنا ایک پختہ مشق اور لطیف الطبع شاعر ہی کا کام ہے۔

مرا دل غیرت پروانہ دادند ز سوز او ترا پروانہ دادند

دوائے درد من غربت شد آخر کہ زحمت بیش ازیں خانہ دادند

نشد کوتاہ و عمر آمد بپایاں بیاد ما عجب افسانہ دادند

بخشت حسن آب و دانہ دادند فریبت اے دل فرزانہ دادند

چہ می پرسی ز حال عاشقانش دل و جاں در رہ عشق مردانہ

دلم کشتی بحر آشنائی کہ سکاں در کف بیگانہ دادند

زحق مہر بتاں خواہم کہ از دل مرا ہم کعبہ ہم بت خانہ دادند

قرعۂ فال من کنوں دہ چہ فلک بکام زد ناز مکن بیا بگو با کہ شدی تو نام زد

شکر گزار سامعاں چوں نشوند بیہشاں حرف خامشی بابت با ہمہ لا کلام زد

مہر سپہر بے ثبات آئینہ دار آفتاب صبح اگر نواختہ د بر سر خاک شام زد

پیکِ صبا جز آہ سرد از تو حکایتے نہ کرد — آتش ناز در دلم آہ ازیں پیام زرد

اے کہ بامن نامرد گشتی بعالم ہوشدار — تا نگردی در جہاں بدنام و رسوائے دگر

چوں شود انجام کار عشق یار سنگدل — من یکے بے صبر و دل ہم ناشکیبائے دگر

گل بجائے خار و بلبل زار باشد در چمن — رفت او بہر تماشا شد تماشائے دگر

راہِ او مشکل گذار و من ہمیں سرگرم شوق — یا نہادم رفت طاقت چوں نہم پائے دگر

یارب ترحمے بدل سخت یار بخش — یا صبر وافرے بمن بیقرار بخش

دردیٔ غصہ صاف طرب ہر چہ میدہی — ساقی ز دست تست مرا خوشگوار بخش

یہ اشعار بلحاظ سلاست اور لطف زبان کے خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں

از پائے فگندست مرا شوق رفعت — بے سایہ خدایا نشود سرور دانش

معراج من بس شدہ اے چرخ رفعت — رفتم اگر از پائے بیفتم بزبانش

نہایت بلیغ شعر کہا ہے۔ شاعر آسمان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ میرے لئے بھی معراج کافی ہے کہ میں اس کی محبت کی راہ میں اس طرح لڑکھڑا کر گروں کہ میرا ذکر اس کی زبان پر آ جائے۔

چرخ کا لفظ اور از پا افتادن اور بزبان افتادن کا تقابل اور اس سے معراج کے مضمون کا استنباط نزاکت خیال اور بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے۔

زخمم چو کند شکوہ لب تشنگی از تو — از تیر دگر بار زتواں بست دہانش

یہ شعر بھی تغزل کا بہترین نمونہ ہے کہتے ہیں کہ اگر میرا زخم تجھ سے لب تشنگی کی شکایت کرے تو اس کا علاج بہت آسان ہے۔ ایک تیر اور لگا کر اس کا منہ بند کر دے

شاعر نے مشق و ستم میں معشوق کی کوتاہ دستی اور اپنے حریص لذت آزار ہونے کو نہایت لطیف پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔

آخر چہ گوئیمت کہ چہ برمن رود بہ ہجر — ہرگز نگفتہ ام چہ دمے ہم ندیم خویش

کہتے ہیں کہ ہجر میں جو کچھ مجھ پر گذری اس کو کیونکر بیان کر سکتا ہوں جب کہ مجھے ایک لحظہ بھی اس کی فرصت نہیں ملی کہ میں اپنی حالت پر غور کرتا اور اس کو سمجھ سکتا۔ اس وسیع مضمون کو "ندیم خویش" دو مختصر لفظوں میں ادا کیا ہے۔

عین الیقین ز روئے تو مارا نصیب نیست ۔۔ تاکے بسر بریم با مید و بیم خویش

اس شعر میں مجاز سے زیادہ حقیقت کا پہلو غالب ہے۔ کہتے ہیں۔ تو نے اپنے رُخ تاباں کا جلوہ دکھا کر ہم کو عین الیقین کے رتبہ پر ابھی تک نہیں پہنچایا ہے آخر کب تک ہم اس امید وبیم کی حالت میں بسر کریں۔ ایمان خوف ورجا کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ لیکن سالک اس حالت پر قانع اور اس مقام پر ٹھیرے رہنا نہیں چاہتا بلکہ عین الیقین کے درجہ پر پہنچنا اور "لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً" کی کیفیت حاصل کرنے کے لئے بیچین رہتا ہے۔

اے عشق دیدہ کہ جہانی نمودہ ام

حیران تندرستی فکر سقیم خویش

شب زلفش کہ ہر دم با دچشم جلوہ اندو دش ۔۔ سر خورشید حسن آمد فرو در ظل ممدودش

لب لعلش کہ خط سبز دارد مشک آلودش ۔۔ نغان زین آتش خاموش عالم سوز پُر دودش

بدل گرد غم دوران بلائے بود اے ساقی ۔۔ زلطف تو مے روشن ازین آئینہ بزدودش

رخش در سادگی سوز دل وجان آنمیدانم ۔۔ چہ خواہد کرد این آتش نمایان چون شود دودش

تاثیر گرم آہ سحر آزمودہ ایم ۔۔ تا پردہ زآفتاب رخ او کشودہ ایم

داریم چشم عفو خطائے چو رفتہ است ۔۔ باخود نہ بودہ ایم اگر با تو بودہ ایم

نازم بضعف خویش کہ اندر ہوائے عشق ۔۔ پرواز ہا بسوئے تو بے بال و پر کنم

تاکے درآرزوئے تو یک دم نظر کنم ۔۔ بگذار تا بروئے تو یک دم نظر کنم

از سوز دل چو قصۂ شوق تو سر کنم ۔۔ در خامہ جائے حرف سراسر شرر کنم

حسن چوں عشق چو در بندِ حیا می بینم چشمِ جانان و لبِ خویش نہ وا می بینم
چشمِ ہر حلقہ کہ در زلف رسا می بینم در تماشائے رخت رو بقفا می بینم
کس بہ بدبخت دمبادا کہ بہ بیند گاہے آنچہ از دیدۂ مشتاق شما می بینم

آسودہ نگردم نہ ز رفتار نشینم تا آنکہ بخویش آیم و با یار نشینم
انگشت نما میکندم مشعلِ آہم گر بر رہِ تو ہم بہ شبِ تار نشینم
عیشِ دگراں را بکنم از چہ منغص ہر جا کہ روم با دلِ افگار نشینم

گشتم غبارِ خاطرِ یوسف جمالِ خویش گردے نیم کہ پیرویِ کارواں کنم
لطف و غضب بود گلِ رعنائے باغِ حسن نظارۂ بہار ز خوش این و آں کنم
گر چشمِ یار می کند امداد گردشے ایدل تلافیِ ستمِ آسماں کنم
در گردِ راہِ منزلِ مقصود گم شدست یارب چہ فکرِ غارتِ ایں کارواں کنم

غیرت و رشک

از رشکِ نقشِ پائے چو پر داغ شد دلم چنداں طپیم کہ راہ ترا بے نشاں کنم

عاشقانہ

ایکہ گفتی کہ مست روئے بدیدن ندہم گوش کن من بخود ایں حرف شنیدن ندہم
تا پریشاں نشود بوئے ہوا داریِ من باد در کوچۂ آں زلف وزیدن ندہم
گو بیالائے بخون دلِ من پنجۂ خویش پشتِ آں دست نگارینش گزیدن ندہم

بر وعدۂ تو بود چہ دار و مدارِ من کس را نماند ہیچ دگر اعتبارِ من
از بہرِ من چنانکہ تو ہستی بکارِ خویش من نیز ہم برائے تو باشم بکارِ من
با قربِ معنوی چہ بود بعدِ ظاہری از من کنارہ گیر و بیا در کنارِ من
عمریست گرچہ مستِ بے ہوش بودہ ام بشکست چشمِ او بنگاہے خمارِ من
چنداں سبک شدم کہ برفتم ز خاطرش (ضعف و ناتوانی) ضعفم گرفت عاقبتِ کار بارِ من

امید استوار من و عهد سست او
بر خود گذاشتند سراسر مدار من

امیّدواری

در عرض آرزو نه کنم عشق کوتهی
باشد شود قبول یکے از هزار من

تاثیرِ شعر کی وجہ

آویزهٔ گوش دل و جان شعر تر من
کز بحرِ غمِ عشق تو خیزد گهرِ من

ثبات و استقلال

با این همه وارفتگی از جائے نرفتم
گوئی که مقام ست بمنزل سفر من

محبت کی عالمگیری

مهر از دل او رفت و گرفت ست بعالم
از سنگ در آئینه بیاید شرر من

ناکامی

از نیم نگاہے نکشادی گره دل
بر بستهٔ تشنهٔ آرزوئے این قدر من

تخیل

عمرے ست غم سر که گرفت ست سرخویش
باشد گریبان خیالِ تو سر من

تاثیرِ عشق

عشقش چه اثر داده زبان و سخنم را
آں شعلهٔ من باشد و این شد شرر من

بنگر که رخِ خوب تو دیدن نتوانم
چوں دست زپایم نفشاند نظر من

هرگز نه رسد با همه جهد یکے که نمودم
بر پائے چو سیم تو رخ ہمچو زر من

دایم به تماشائے گلستان خلیل است
از داغ جفائے تو دل دیده ورِ من

سرگشتهٔ دور فلک شعبده بازم
آغازے و انجام ندارد سفر من

مانند چراغیکه بسوزند ز آتش
شمع رهِ شوق تو بود چشم تر من

در منزل دیوانگی و دشت خودیم
جز من نبود هیچ کسے راهبرِ من

جز اخترِ تابندۂ بختم کہ نہ آید   یک رنگیٔ آئینہ ز شام و سحر من
از جزیۂ خاک رہِ الفت چہ بگویم   پس تر بفشند ہر قدم پیشتر من
برگشتم آخر شکند نخوت و نازش   در دست شکست ست ہمانا ظفر من
پیچیدہ بود عشق رہِ قطعِ تعلق   کو راہبرے تا بشود راہبر من

گرہ با زلفِ او چوں رشتۂ جاں میتواں کردن   بدل جمعی خیالاتِ پریشاں میتواں کردن

مطلب یہ ہے کہ اس کی زلف سے وہی تعلق ہے جو جسم کو جان کے ساتھ ہے اگرچہ یہ تکلیف و پریشانی سے خالی نہیں لیکن انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ دلجمعی کی حالت میں بھی پریشاں خیالی سے باز نہیں رہتا۔ اور اس کو چین سے بیٹھنے میں مزا نہیں آتا۔

جنوں بندِ نقابِ یار خنداں میتواں کردن   چہ درہا و از یک چاکِ گریباں میتواں کردن

یعنی بندِ نقابِ یار کی گرہ اگر کھل سکتی ہے تو دستِ جنوں ہی سے کھل سکتی ہے اور اس کو اس کے خنداں ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ کیوں کہ مجنوں کو دیکھ کر ہنسی اڑائی جاتی ہے کہتے ہیں کہ ایک چاکِ گریباں سے جو دستِ جنوں کا رہینِ منت ہے۔ کیسے کیسے فتوحات حاصل ہوئے۔ اور کتنے خوشی و مسرت کے دروازے کھل گئے ہیں۔

نظر زنجیرِ دل۔ در گوشۂ چشم تو زنداں کن   ازیں بہ بے سر و پا را چہ ساماں میتواں کردن

دل جیسے بے سر و پا مجنوں و لایعقل کے لئے اس سے بہتر اور ساماں کیا کیا جا سکتا ہے کہ تیری نظر کو اس کی زنجیر اور تیرے گوشۂ چشم کو اس کا قید خانہ بنایا جائے۔

بباغِ سینۂ پر داغ چشمِ خونفشاں ریزد   شرر ہائے کہ از شبنم بہ بستاں میتواں کردن

تشبیہ کے لحاظ سے نہایت بدیع شعر کہا ہے۔ سینۂ پر داغ کو باغ سے آنکھ کی خونفشانی کو شبنم سے۔ اور شبنم کو شراروں سے تشبیہ دے کر یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ جو کام شبنم کے شرارے باغ میں کرتے ہیں۔ یعنی رنگ برنگ کے پھول کھلاتے ہیں۔